مظفر ملک

ڈاکٹر اقبال بحیثیت مرثیہ گو

مرثیہ کا تعلق اُن شعری تخلیقات سے ہے جو اصطلاحاً محرکات داخلی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ کیونکہ جب کوئی شاعر اپنے کسی محبوب، عزیز یا قومی رہنما کی موت یا کسی قوم، ملک یا شہر کی تباہی سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے تو اپنے ذاتی کوائف، واردات، افکار اور تجربات کا اس طرح ابلاغ و اظہار کرنا چاہتا ہے کہ جو کچھ اس پر بیتی ہے دوسروں پر بھی منتقل ہو جائے۔ اور یوں اس کے خیالات و احساسات جو شعری جامہ اختیار کر لیتے ہیں اسے ہم مرثیہ کا نام دیتے ہیں۔

اردو ادب میں مرثیہ کی اصطلاح سے لکھنؤ کے مخصوص ماحول سے متعلق وہ نیم مذہبی، نیم تاریخی اور نیم مجلسی اوصاف کی حامل نظم مراد ہے جس میں داستانِ کربلا و مصائب اہل بیت اور واقعات شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام و رفقائے عظام کا بیان ہو۔ اس لیے 'مرثیہ' کا کلمہ سنتے ہی ہمارا ذہن فوراً اس مخصوص 'اصطلاحی مرثیہ' کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور ہم شعر و سخن کے ان شہ پاروں کو نظر انداز کر جاتے ہیں جو شخصی یا اجتماعی تاثرات کے ماتحت منظوم ہوئے ہیں۔

لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ غم و الم کے جذبات کے اظہار کے لیے جس زبان و بیان کی ضرورت ہوتی ہے اس کے ارتقاء میں اس 'اصطلاحی مرثیہ' کا نمایاں حصہ ہے۔ اور اردو زبان کے کسی شاعر کے لیے ممکن نہیں کہ 'غم انگیز جذبات' کے اظہار کے لیے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس ذخیرۂ الفاظ و اندازِ بیان سے متاثر نہ ہو جو مرثیہ گو شعراء کی بدولت اردو ادب میں منتقل ہوا۔ مولانا حالی کا قومی زوال کے ماتم کے لیے مسدس کا انتخاب کرنا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ ذہنی طور پر وہ کسی نہ کسی حد تک 'اصطلاحی مرثیے' سے متاثر تھے۔

اس بحث سے مقصود یہ ہے کہ علامہ مرحوم سے قبل اردو زبان میں مذہبی، شخصی اور اجتماعی مرثیوں کے نمونے موجود تھے۔ اور موزوں ذخیرۂ الفاظ کی بھی کمی نہ تھی۔ یعنی فنی ارتقاء کے لحاظ سے یہ صنف سخن بھی کسی طرح کم مایہ نہ تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ احساسات و جذبات کی وہ شدت جو

علامہ مرحوم کے کہے ہوئے مرثیوں میں نمایاں ہے ان سے پیشتر اگر مفقود نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔
علامہ نے مذہبی مرثیے نہیں کہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی بے مثل جرأت اور قربانی کی عظمت اور مقاصد سے اس قدر متاثر ہیں کہ اس واقعے کے بیان میں غم انگیز جذبات کی بجائے حریت نواز خیالات کی اشاعت کو زیادہ اہمیت دیتے ہوئے فلسفۂ شہادت کے بیان پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ مثنوی 'رموزِ بے خودی' میں حضرت امام مظلوم کے متعلق اپنے تاثرات کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

عشق را آرام جاں حریت است — ناقہ اش را ساربان حریت است
آں شنیدستی کہ ہنگامِ نبرد — عشق با عقلِ ہوس پرور چہ کرد
آں امام عاشقاں پور بتولؓ — سروِ آزادے ز بستانِ رسولؐ
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر! — معنی ذبحِ عظیم آمد پسر
بہر آں شہزادۂ خیر الملل — دوش ختم المرسلیںؐ نعم الجمل
سر خرد عشق غیور از خونِ او — شوخیٔ ایں مصرعہ از مضمونِ او
در میانِ اُمت آں کیواں جناب — ہم چو حرفِ قل ہو اللہ در کتاب
موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید — ایں دو قوت از حیات آید پدید
زندہ حق از قوتِ شبیری است — باطل آخر داغِ حسرت میری است
چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت — حریت را زہر اندر کام ریخت
خاست آں سر جلوۂ خیر الامم — چوں سحاب قبلہ باراں در قدم
بر زمینِ کربلا بارید و رفت — لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تا قیامت قطعِ استبداد کرد — موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد
بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است — پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است
مدعائش سلطنت بودے اگر — خود نکردے با چنیں ساماں سفر
دشمناں چوں ریگِ صحرا لاتعد — دوستانِ او بہ یزداں ہم عدد
سرِّ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ بود — یعنی آں اجمال را تفصیل بود
عزمِ او چوں کوہساراں استوار — پائدار و تند سیر و کامگار

تیغ بہرِ عزتِ دین است و بس　　　مقصد او حفظ آئین است و بس
ماسوای اللہ را مسلماں بندہ نیست　　　پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
خونِ او تفسیر ایں اسرار کرد　　　ملتِ خوابیدہ را بیدار کرد
تیغ لا چوں از میاں بیروں کشید　　　از رگِ اربابِ باطل خوں کشید
نقشِ الا اللہ بر صحرا نوشت　　　سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت
رمزِ قرآں از حسینؓ آموختیم　　　ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم
شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت　　　سطوتِ غرناطہ از ہم یاد رفت
تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز　　　تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز

اے صبا اے پیک دور افتادگاں
اشک ما بر خاکِ پاک او رساں

خاندانِ رسالت سے حضرت علامہ کی عقیدت ان کے کلام سے جابجا ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن واقعاتِ شہادت کے بیان میں مرثیت کے پہلو کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کیونکہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت میں وہ اسلام کے فروغ کے راز کو سربستہ سمجھتے ہیں:

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر　　　مرگِ پورِ مصطفٰی چیزے دگر

ان کے کلام میں مرثیت کا پہلو وہاں نمایاں ہوتا ہے جہاں قومی زوال کا ذکر ہو۔ مثلاً جب وہ سلطان محمود کے مزار پر پہنچتے ہیں تو بے قرار ہو جاتے ہیں:

خیزد از دل نالہ ہا بے اختیار　　　آہ ایں شہرے کہ ایں جا بود پار
آں دیار و کاخ و کو ویرانہ ایست　　　آں شکوہ و فال و فر افسانہ ایست

اس کی صاف وجہ ہے کہ انہیں سلطان محمود کی ذات سے کوئی بحث نہیں بلکہ ان کی بے اختیاری کی وجہ وہ اجتماعی زوال ہے جس کے آثار انہیں غزنی کے ویرانہ میں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد والی نظم بعنوان "مناجاتِ مردِ شوریدہ در ویرانہ غزنی" میں وہ یوں گوہر افشاں ہوتے ہیں:

اے خدائے نقش بند جان و تن　　　با تو ایں شوریدہ دارد یک سخن
فتنہ ہا ایں سنم در ریں و دیر کہن　　　فتنہ ہا در خلوت و در انجمن
عالم از تقدیر تو آمد پدید　　　یا خدائے دیگر او را آفرید

ظاہرش صلح و صفا باطن ستیز — اہل دل را شیشۂ دل ریز ریز
صدق و اخلاص و صفا باقی نماند — "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند"

قومی و اجتماعی زوال کے ماتم کے سلسلے میں "اشکے چند برافتراق ہندیاں" کے عنوان سے "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" میں اپنے غم و الم کا اظہار اس طرح کیا ہے:

اے ہمالہ اے اٹک اے رود گنگ — زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ
پیر مرداں از فراست بے نصیب — نوجواناں از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیر غیر — خشت ما سرمایۂ تعمیر غیر
زندگانی بر مراد دیگراں — جاوداں مرگ است نے خواب گراں
نیست ایں مرگے کہ آید ز آسماں — تخم او بالد از اعماق جاں
صید او نے مردہ شو خواہد نہ گور — نے ہجوم دوستاں از نزد و دور

اجتماعی یا ملی مرثیہ کے ضمن میں اب تک جتنی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ وہ علامہ کے فارسی کلام میں سے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قبیل کا اردو کلام نہ صرف یہ کہ فارسی کلام کی نسبت مقدار میں کئی گنا زیادہ ہے بلکہ جذبات و احساسات کی شدت کی وجہ سے اس کا درجہ بھی بہت بلند ہے۔ اس سلسلہ کا سب سے پہلا مرثیہ جزیرہ سسلی کے "حسن عالم سوز کے نظارہ آتشیں" کے ماتم میں ہے۔ شاعر نے اپنے دل کے درد کی تصویر کشی جن مناسب الفاظ میں کی ہے اس کا جواب ناممکن ہے۔ مطلع ہی کتنا درد انگیز ہے:

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونناب بار — وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

آخری بند ملاحظہ ہو کس قدر درد آمیز ہے:

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں؟ — تیرے ساحل کی خموشی میں ہے انداز بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں — جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں
رنگ تصویر کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے — قصہ ایام سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا

سسلی کی گذشتہ عظمت کے مرثیہ کے بعد بلاد اسلامیہ یعنی دلی، بغداد، قرطبہ، قسطنطنیہ اور یثرب کا ذکر اسی انداز میں کیا گیا ہے۔ دلی کو "مسجود دل غم دیدہ اور خانقاہ عظمت اسلام" کے موزوں خطابات

عنایت فرمائے ہیں۔ ذرے ذرے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے۔" کتنا غم انگیز ہے! لیکن اس نظم میں ماضی کی شان وشوکت کے درد خیز بیان کے باوجود مرثیت کا وہ امتزاج نہیں جو مسلسل والی نظم میں تھا۔ اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں روشن مستقبل کی رجائی کیفیات نے یاس اور مرثیت کے تاثر کو دبا دیا ہے۔ آخری شعر ہے:

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں　　صبح ہے تو اس چمن میں گوہر شبنم بھی ہیں

تھوڑا سا آگے چلیں تو اس سلسلہ کی شاہکار نظم بعنوان "گورستان شاہی" ہے۔ یہاں شاعر منظر فطرت کے بیان سے حزنیہ تاثر پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کرتا ہے۔ جو کھینچا تو ایک مکدر، خاموش اور سنسان رات کا ہے مگر تصویر شاعر کے اپنے جذبات کی ہے:

چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں
صبح صادق رو رہی ہے رات کی آغوش میں

کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی　　بربطِ قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی

باطنِ ہر ذرۂ عالم سراپا درد ہے
اور خاموشی لبِ ہستی پہ آہ سرد ہے

اس نظم میں نہ صرف یہ کہ دنیا کی بے ثباتی، گذشتہ عظمت کی یاد اور موت کے آہنی چنگل کی مضبوطی کے مضامین کا فنکارانہ بیان ہے جو بجائے خود حزنیہ تاثرات پیدا کرنے کا بہت بڑا حربہ ہیں، بلکہ بعض اشعار تو خالص "بین" کے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بند دیکھیے:

شورشِ بزمِ طرب کیا عود کی تقریر کیا　　دردمندانِ جہاں کا نالۂ شبگیر کیا!
عرصۂ پیکار میں ہنگامۂ شمشیر کیا!　　خون کو گرمانے والا نعرۂ تکبیر کیا!

اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں
سینۂ ویراں میں جانِ رفتہ آ سکتی نہیں

شکوہ اور جواب شکوہ، مسدس حالی کی صدائے بازگشت ہیں۔ صرف اندازِ بیان کا فرق ہے۔ دونوں کا موضوع قومی ادبار ہے۔ شکوہ کے آخری آٹھ بند اور جواب شکوہ کا بیشتر حصہ مسلمانوں کے اجتماعی زوال کے اسباب سے بحث کرتا ہے۔ نیز اس پر اظہارِ الم بھی کرتا ہے۔ لیکن یہ امر خصوصی توجہ کا محتاج ہے کہ ان دونوں مسدسوں کا اندازِ بیان انہیں مرثیہ کی حد بندیوں سے گو پوری طرح سے خارج نہیں کرتا مگر بیرونی حدود تک ضرور پہنچا دیتا

ہے۔ بظاہر یہی حال شمع و شاعر کا ہے۔ مگر جہاں تک سوز کا تعلق ہے وہ اس نظم میں زیادہ نمایاں ہے۔ بعض اشعار میں "تاسف اور اظہار درد وغم" غالب ہے۔ مثلاً:

وہ جگر سوزی نہیں وہ شعلہ آشامی نہیں
فائدہ پھر کیا جو گرد شمع پروانے رہے

خیر تو ساقی سہی لیکن پلائے گا کسے ؟
اب نہ وہ مے کش رہے باقی نہ میخانے رہے

رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

آج ہیں خاموش وہ دشت جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلیٰ رہی لیلیٰ کے دیوانے رہے

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی
شہر ان کے مٹ گئے آبادیاں بن ہو گئیں

سطوت توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذر برہمن ہو گئیں

خود تجلی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی
وہ نگاہیں نا امید نور ایمن ہو گئیں

اڑتی پھرتی تھیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں
دل میں کیا آئی کہ پابند نشیمن ہو گئیں

وسعت گردوں میں تھی ان کی تڑپ نظارہ سوز
بجلیاں آسودۂ دامان خرمن ہو گئیں

دیدۂ خونبار ہو منت کش گلزار کیوں ؟
اشک پیہم سے نگاہیں گل بدامن ہو گئیں

اگرچہ مجموعی طور پر یہ نظم "قومی ادبار کے مرثیہ" کی بجائے روشن مستقبل کی نوید ہے مگر جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہے مرثیت کے جراثیم سے پاک نہیں۔ یہی حال خضر راہ کا ہے۔

بال جبریل کی دو نظمیں بعنوان "مسجد قرطبہ" و "ہسپانیہ" بھی انہیں جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ "مسجد قرطبہ" کے مندرجہ ذیل اشعار دیکھئے:

آہ وہ مردان حق وہ عربی شہسوار
حامل خلق عظیم صاحب صدق و یقیں

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب
سلطنت اہل دل فقر ہے شاہی نہیں

جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب
ظلمت یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے

رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں — آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے — عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں

ثانی الذکر نظم (ہسپانیہ) میں تو وہی درد کی چاشنی ہے جس کا مزہ "مسلمی" کے مرثیہ میں ملتا ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس خوبصورت فن پارے پر تبصرہ یا اس لذتِ الم کا بیان محال ہے۔ شعری کیفیات کو نثر کے قالب میں ڈھالنا بعض اوقات نہ صرف یہ کہ دشوار ہو جاتا ہے بلکہ فقدانِ لذت کا بھی موجب ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں درد و کرب کی خلش کا مزہ لیجئے:

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے — مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں — خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں
روشن تھیں ستاروں کی طرح ان کی سنانیں — خیمے تھے کبھی جن کے ترے کوہ و کمر میں
پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی؟ — باقی ہے ابھی رنگ میرے خونِ جگر میں
کیونکر خس و خاشاک سے دب جائے مسلماں — مانا وہ تب و تاب نہیں اس کے شرر میں
غرناطہ بھی دیکھا میری آنکھوں نے ولیکن — تسکینِ مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں
دیکھا بھی دکھایا بھی سنایا بھی سنا بھی — ہے دل کی تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں

اسی سلسلہ کی ایک مختصر سی نظم "مسجد قوت الاسلام" کے عنوان سے ضربِ کلیم میں شامل ہے۔ کل چھ اشعار ہیں مگر تاثیر کے لحاظ سے ایک سے ایک بڑھ کر اس ترکش کا پہلا تیر ہی دل و جگر کو چھید کر رکھ دیتا ہے:

ہے مرے سینۂ بے نور میں اب کیا باقی
لاالٰہ مردہ و افسردہ و بے ذوقِ نمود

یہاں تک اجتماعی مرثیہ کا بیان تھا۔ اب میں شخصی مرثیے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ بالعموم شخصی مراثی میں اجتماعی مرثیوں کے مقابلے میں درد و الم کا اظہار زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ مرثیہ گو کا مرنے والے سے تعلق جتنا قریب کا ہوگا مرثیہ میں درد کی شدت اسی نسبت سے نمایاں ہوگی۔ اس لیے شخصی مرثیے داخلی شاعری کے عمدہ نمونے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان میں شاعر کا تخاطب زیادہ تر اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ وہ جذباتِ غم سے سرشار ہو کر محض اپنا جی ہلکا کرنے کے لیے آہ و فغاں کا سہارا لیتا ہے۔ یہ علاحدہ بات ہے کہ اس طرح اس کی طبیعت کی موزونیت اور شاعرانہ صلاحیتیں شعر و ادب کے سرمایہ میں لافانی شاہکار کے اضافے کا موجب ہو جاتی ہیں۔

اگرچہ ترتیب زمانی کے لحاظ سے علامہ مرحوم کا لکھا ہوا مرزا غالب کا مرثیہ اولیت کے شرف کا حامل ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس میں مرزا مرحوم کی عظمت اور ان سے شاعر کی والہانہ عقیدت کا بیان اس قدر غالب ہے کہ اس میں درد و سوز کا پہلو دب گیا ہے۔ اس کے برعکس داغ کے مرثیے میں علامہ کے مرحوم سے بڑے قریبی اور گہرے تعلقات کا سراغ ملتا ہے۔ ساری کی ساری نظم درد و گداز اور رنج و الم کے جذبات سے پُر ہے۔ اگر میں یہ دعویٰ کروں تو بے جا نہ ہوگا کہ اس سے پہلے اردو زبان میں اس رتبہ کا شخصی مرثیہ نہیں لکھا گیا۔ اس نظم کی خوبی غم انگیز فضا کی فن کارانہ تخلیق ہے جو شروع سے آخر تک یکساں اور متوازن رہتی ہے۔ اور یوں یہ نظم اچھا خاصا "نوحہ" بن گئی ہے۔

تمہید یہ ہے کہ غالب، مہدی، مجروح اور امیر مینائی کی وفات کے بعد محض داغ کی بدولت شمع سخن روشن تھی اور یہ امر کسی حد تک باعث اطمینان تھا کہ گیسوئے اردو کی مشاطگی ہو رہی ہے مگر آج جب کہ آخری سہارا بھی ختم ہو گیا تو سب امیدیں اور توقعات بھی ختم ہو گئیں۔ کتنا یاس انگیز منظر ہے؟ دوسرے اور تیسرے بند میں مرحوم کی خوبیوں کو گنوا کر اس کی عظمت اور اس کی وفات سے پیدا شدہ نقصانات کا درد انگیز انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ چوتھے اور پانچویں بند کا انداز مُبکی ہے جسے مرثیہ کی اصطلاح میں "بین" کہا جاتا ہے:

اشک کے دانے زمین شعر میں بوتا ہوں میں　　تو بھی رو اے خاک دلی داغ کو روتا ہوں میں

اس کے بعد ایک مختصر سی نظم سوامی رام تیرتھ کے دریا میں ڈوب کر مرنے کے حادثہ پر لکھی گئی ہے۔ اقبال، سوامی صاحب کے ذوق و شوق سے بہت متاثر تھے اور اپنے اس تاثر کا اظہار انہوں نے چھ اشعار میں کر دیا ہے۔ اس مضمون میں اس نظم پر اس سے زیادہ تبصرہ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔

ایک عرب لڑکی فاطمہ بنت عبداللہ جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی کے مرثیے میں علامہ مرحوم وہی انداز اختیار کرتے ہیں جو انہوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے واقعات کے بیان میں انتخاب کیا تھا۔ یعنی وہ شہیدہ کی موت میں قوم کی حیات کا نکتہ پا کر اس کی ابدی زندگی کو جسمانی موت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور شبنم امتثال آنکھ اور نالۂ ماتم کے ساتھ نغمۂ عشرت کے احساس کو دبا نہیں سکتے:

فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے　　نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے!　　ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

یہ اس قرآنی فیصلہ کے زیر اثر ہے کہ شہید مرتے نہیں بلکہ انہیں حیات ابدی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے

کے علاوہ شہادت سے جو قوم کو فائدہ پہنچتا ہے وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکتے:

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

حالی کی وفات پر انہیں شبلی بھی یاد آ گئے اور اس طرح انہوں نے شبلی اور حالی دونوں کی موت پر بیک وقت "شبنم افشانی" کی ہے۔ اس نظم میں بھی افراد کی جگہ قوم غالب ہے۔ یعنی افراد کے مرنے سے جو نقصان قوم کا ہوا اقبال اس کے لیے فکر مند ہیں:

مسلم مرے کلام سے بیتاب ہو گیا — غماز ہو گئی غم پنہاں کی آہ سرد
کہنے لگا کہ دیکھ تو کیفیت خزاں — اوراق ہو گئے شجر زندگی کے زرد
خاموش ہو گئے چمنستاں کے رازدار — سرمایہ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہل گلستاں — حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد

"اکنوں کسے دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟"

والدۂ مرحومہ کی یاد میں" سوز و گداز، حسرت اور تفکر کا مرقع ہے۔ اس نظم کے پہلے اور دوسرے بند میں دنیا کی بے ثباتی کا مضمون بیان کیا گیا ہے۔ تیسرے بند میں اقبال اپنے بچپن کا زمانہ یاد کر کے والدہ کے احسانات کا تذکرہ اجمالی طور پر کرتے ہیں۔ چوتھے بند میں ایک مسلمہ حقیقت کا بیان ہے کہ ماں کے سامنے علم کی سنجیدہ گفتاری اور بڑھاپے کا شعور بھی "بچپن کا روپ" دھار لیتا ہے۔ پانچویں بند میں ان محرومیوں کا بیان ہے جن کا تصور ہر وہ شخص بآسانی کر سکتا ہے جو اپنی والدہ سے محروم ہو چکا ہو۔ انداز بیان نہایت دردناک اور مؤثر ہے۔ ملاحظہ ہو:

کس کو اب ہو گا وطن میں آہ میرا انتظار — کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار
خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا — اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا؟
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا — گھر میرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات — تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی — میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی
وہ جوانی قامت میں ہے جو صورت سرو بلند — تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند
کاروبار زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا — وہ محبت میں تری تصویر وہ بازو مرا

تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ صبر سے ناآشنا صبح و مسا روتا ہے وہ

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

اس نظم کے باقی بند موت و حیات کے فلسفہ کے بیان میں ہیں۔ ان کے مطالعہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اپنے الم زدہ دل کو حقائق اور فلسفہ کے مرہم سے آرام پہنچانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ لیکن لہجہ میں درد کی تلخی آخر تک موجود رہتی ہے۔

پانچ اشعار کی ایک مختصر سی نظم مسٹر جسٹس شاہ دین ہمایوں مرحوم کی یاد میں ہے۔ یہاں بھی موت کو "صبحِ دوامِ زندگی" کا خطاب دے کر اس کے خوفناک تصور کو آسان بنا دیا ہے۔ اور اس طرح وہ درد جو انہیں اپنے ایک عزیز دوست کے مرنے سے ہوا تھا فلسفہ کی ڈھال پر برداشت کرنے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی تلخیوں کے مقابلے میں اقبال جن ہتھیاروں کی مدد سے سینہ سپر ہوتے ہیں ہر کہ و مہ کے بس کا روگ نہیں۔

ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت علامہ درد سے بے قابو اس وقت ہوتے ہیں جب انہیں کسی فرد کی موت میں قومی نقصان کی جھلک نظر آتی ہے۔ سر راس مسعود مرحوم کے 'مرثیہ' میں بھی یہی کیفیت ہے۔ چنانچہ یہ شاہ پارہ احساس و جذبات کے خلوص کا مرقع ہے۔ مرثیہ کی مخصوص تکنیک (TECHNIQUE) کے لحاظ سے بھی یہ نظم ارفع و اعلیٰ ہے۔ تمہید جسے قصیدہ میں "تشبیب" اور مرثیہ میں "چہرہ" کہتے ہیں فنی لحاظ سے بڑی مشکل چیز ہے۔ اس میں اچھے اچھے فن کاروں کی قلعی کھل جاتی ہے۔ مگر حضرت علامہ مرحوم نے اسے جس انداز میں نبھایا ہے وہ ان کی شاعرانہ عظمت کا بیّن ثبوت ہے:

یہ مہر و ماہ یہ انجم یہ آسمانِ کبود کسے خبر کہ یہ عالم عدم ہے یا کہ وجود
خیال جادہ و منزل فسانہ و افسوں کہ زندگی ہے سراپا رحیلِ بے مقصود

اور پھر اصل موضوع کی طرف کس انداز سے "گریز" فرماتے ہیں:

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود!
زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اس کی وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود
مجھے رلاتی ہے اہلِ جہاں کی بے دردی فغانِ مرغِ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غمِ دوست نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود

"دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است" (سعدی)

نظم کا خاتمہ کتنے دل کش انداز میں ہے۔ مرحوم کی عظمت کا احساس کس خوبصورت طریقے سے دلایا گیا ہے:

مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر — زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات
حریم ذات ہے اس کا نشیمن ابدی — نہ تیرہ خاک ہے نے جلوہ گاہ صفات

خود آگہاں کہ دریں خاکداں بروں جستند
طلسم مہر و سپہر و ستارہ بشکستند!

سرگزشتِ غزالی

مترجمہ محمد حنیف ندوی

امام غزالی کی "المنقذ" کا اردو ترجمہ جس میں انہوں نے اپنے فکری و نظری انقلاب کی دلچسپ داستان بیان کی ہے اور بتلایا ہے کہ کس طرح انہوں نے جبہ و عبا اور مسند و دستار کی زندگی چھوڑ کر گلیم و فقر کی روش اختیار کی اور تصوف کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ قیمت ۳ روپے۔

اسلام اور مذاہب عالم

مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی

مذاہب عالم اور اسلام کا ایک تقابلی مطالعہ۔ یہ کتاب یہ وضاحت کرتی ہے کہ اسلام انسان کے مذہبی ارتقا کی فیصلہ کن منزل ہے۔ اس نے تمام مذاہب کے حقائق کو یکجا کر کے اپنی وحدت میں سمو لیا ہے قیمت ۴ روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور